ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1, 2024

ناول "خدا کی بستی" میں سماجی مسائل کی عکاسی

Depiction of Social Issues in the Novel "Khuda ki Basti"

Raza Akram
M.Phil Urdu, Institute of Southern Punjab, Multan
Email: razaakramali@gmail.com
Shamim Murtaza
M.Phil Urdu, Institute of Southern Punjab, Multan
Email: atiqsaeed285@gmail.com
Dr.Munawar Amin
Assistant Professor, Department of Urdu, Institute of Southern Punjab, Multan
Email: drmunawaramin143@gmail.com

ABSTRACT:
Shaukat Siddique was a famous novelist, fiction writer and dramatist of Urdu literature. "Khuda ki Basti" is the first novel of Shaukat Siddique which was published in 1958 by Maktaba Naya Rahi, Karachi. So far, about 100 editions of this novel have been published. This novel has also gained international fame and it has been translated into 20 different languages of the world. In 1960, this novel was given the "ADAM G" literacy award. This novel fully reflects the Pakistani society. Shaukat Siddique has definitely depicted the society created on the lines of fiction, but has analyzed the social and human psychology in such an artistic way that the story is very close to real life. Its characters and plot have made it a masterpiece by creating compatibility with the subject. The main characters of this novel are Raja and Nosha. In this novel, the weaknesses of the lower, inferior, weak class and all the evils and defects of upper class have been described. Moreover, the novelist has highlighted the social problems of colonialism, economic exploitation, moral decline, exploitation of women's rights, sexual exploitation, and the extreme selfishness of relationships which the modern society is suffering from. All these social problems have been discussed in the following article.

KEYWORDS:
Compatibility, social, defect, colonialism, exploitation, moral decline.

تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں تشکیل پانے والی شہری سوسائٹی جو نیم سرمایہ دارانہ اور نیم جاگیر دارانہ معاشرت کی ترجمان ہے اس کے باطنی حقائق کو نہایت جرات کے ساتھ شوکت صدیقی نے اپنے ناول "خدا کی بستی" میں پیش کیا ہے۔ اس میں مذہب اور جمہوریت کو ڈھال بنا کر ہوس پرستی اور دھوکہ دہی کو شعار بنانے والے پر فریب معاشرے کو آئینہ دکھانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ یہ شوکت صدیقی کا پہلا ناول ہے جو ادبی دنیا میں ان کی پہچان بنا۔ شوکت صدیقی ایک سماجی حقیقت نگار ہیں اور یہ ناول ان کے فکر و فن اور نظریات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے یہ ناول انہوں نے ۱۹۵۷ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۹۵۸ء میں مکتبہ نیاز کراچی سے پہلی بار شائع ہوا۔ اس ناول کے اب تک بیس سے زائد زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں اور سو سے زائد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ۱۹۶۰ء میں اس ناول کو آدم جی ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ناول خدا کی بستی ناول نگار کی فکری سطح کی بھی ترجمانی کرتا ہے۔ شوکت صدیقی فطرتاً ایسے انسان تھے جنہیں انسانی سماج میں پائی جانے والی ناہمواریوں اور انسانیت کی تذلیل سے بہت دُکھ پہنچتا۔ وہ ارسٹوکریسی سے کبھی مرعوب نہ ہوئے نہ ہی اُنہوں نے غریب طبقہ کو کبھی حقارت کی نگاہ سے دیکھا۔ ادب سے لگاؤ نے ان کو کم عمری میں ہی انسانی اقدار سے روشناس کروادیا اور احترام آدمیت ان کا بنیادی فلسفہ رہا۔ جہاں انسانیت کی تذلیل ہوتی دیکھتے اس کے خلاف بغاوت کی آواز بلند کرتے۔ وہ سماج میں عدم مساوات کے خلاف تھے۔ سماج کے محروم اور پس ماندہ طبقات سے گہری ہمدردی رکھتے تھے۔ اس لیے شوکت صدیقی نے غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے والے طبقے کو بطور خاص موضوع بنایا ہے اور ساتھ ساتھ کچھ ذیلی موضوعات پر بھی روشنی ڈالی ہے جو کہ ایسے طبقات سے جڑے ہوئے ہیں جو اپنی اپنی جگہ اس کمزور اور غربت زدہ طبقے کے سماجی، سیاسی اور جنسی استحصال کا نشانہ بنتے ہیں جو بنیادی طور پر اس ناول کا اصل موضوع بنتا ہے، ناانصافی اور استحصالی نظام کے ہمارے

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1, 2024

معاشرے کے کمزور طبقے پر اثرات۔ ساتھ ہی ساتھ اُنہوں نے ہمارے جمہوری نظام کی برائیوں اور کمزوریوں کا پردہ بھی فاش کیا ہے جو ہمارے معاشرے کو مسلسل دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ ناول کے فکری پہلو کے بعد فنی پہلو کو دیکھا جائے تو اس ناول کا کینوس نہایت وسیع ہے۔ یہ ناول موضوع کے اعتبار سے اُردو ناول نگاری کی تاریخ میں ہمارے جدید معاشرے کے سماجی مسائل کو اُجاگر کرتا ہے خصوصاً جو قیام پاکستان کے بعد پیدا ہوئے۔ اگر ناول نگار کی فنی خوبیوں کی بات کی جائے تو شوکت صدیقی کہانی کہنے کے فن پر دسترس رکھتے ہیں۔ انہیں بات کہنے کا فن آتا ہے۔ بات کو بیانیہ انداز میں سادگی کے ساتھ اور روانی میں کہہ دیتے ہیں جس کی بدولت نہ صرف خدا کی بستی بلکہ شوکت صدیقی کے دوسرے ناولوں اور افسانوں کے پلاٹ بھی شوکت صدیقی کو پلاٹ ترتیب دینے کے فن میں دیگر مصنفین میں ایک ممتاز مقام پر کھڑا کرتے ہیں۔ پلاٹ سادگی سے واقعات کی ایک مناسب ترتیب سے تکمیل پاتا ہے جس سے قاری کا پورا تجسس اور دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ قاری کہانی میں محو ہو جاتا ہے اور اسے سارے واقعات سامنے وقوع پذیر ہوتے محسوس ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم آزاد کی رائے اس ناول کے پلاٹ کے بارے میں کچھ اِس طرح ہے:

> ”خدا کی بستی کے پلاٹ میں پیچیدگی، تنوع اور وسعت ہے۔ نیاز، خان بہادر، علی احمد اور سلمان سے متعلق واقعات براہِ راست راجہ اور نوشا کے قصے سے تعلق نہیں رکھتے مگر وہ اس سے بے تعلق بھی نہیں ہیں۔ پلاٹ کی تشکیل میں شوکت صدیقی نے نہایت دانش مندانہ فنی شعور کا مظاہرہ کیا ہے۔ "خدا کی بستی" کا پلاٹ زندگی کے وسیع تجربات کا احاطہ کرتا ہے۔ معاشرے کی نچلی سطح سے اونچی سطح تک جتنی برائیاں اور کمزوریاں موجود ہیں ان کو شوکت صدیقی نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا۔“[۱]

شوکت صدیقی کی تخلیقی خوبیوں کا پورا کمال ان کے اس ناول کے پلاٹ میں جھلکتا نظر آتا ہے۔ کہیں بھی کوئی خامی یا جھول نظر نہیں آتا۔ واقعات کو تسلسل سے پیش کرنا شوکت صدیقی کا فن ہے۔ ناول کے ابواب لگ بھگ پندرہ کے قریب بنتے ہیں۔ پوری کہانی نوزائیدہ مملکت کی ابتدائی مشکلات معاشرتی حقائق نو آبادیاتی دور کے اثرات کو چھوٹی چھوٹی تفصیلات کے ذریعے نہایت باریکی سے پیش کیا گیا ہے۔ ناول کا ہر قصہ مکمل اور معنی خیز نتائج پیدا کرتا ہے۔ اگر اس ناول کی کامیابی کو اس ناول کے پلاٹ کی خوبیوں کی وجہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ جوں جوں واقعات نگاہ سے گزرتے ہیں کہانی کا خلاصہ ذہن میں محفوظ ہوتا چلا جاتا ہے۔ بات سے بات پیدا کرنا اور اتفاقات کے ذریعے کہانی کو آگے بڑھانا شوکت صدیقی کے فن کی نمایاں خوبی بن کر اس ناول کے ذریعے سامنے آتی ہے۔ پہلے باب میں کرداروں کا تعارف اور ابتدائی واقعات کا بیان خود بخود صورتحال کو قاری کے لیے سمجھنا آسان بنا دیتا ہے۔ اگلے چند ابواب میں واقعات کے ذریعے کہانی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی عروج کی طرف گامزن نظر آتی ہے پھر ناول کے چھٹے باب میں ناول کا پلاٹ نئے واقعات سامنے لاتا ہے اِسی باب میں ناول کے اصلاحی پہلو اور معاشرے کے ان پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جن میں فلک پیما تنظیم کی شکل میں ان تنظیموں کی جدوجہد پر روشنی پڑتی ہے جو سماجی ناانصافی اور عدم مساوات کے خاتمے کے لیے پوری قوت سے جدوجہد کرتی اور پسے ہوئے طبقات کے حقوق کے لیے لڑتی نظر آتی ہیں جس سے ہمارے معاشرے کے روشن پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔

اس ناول کے ساتویں باب میں شر پسند عناصر اور جرائم پیشہ افراد کو مذموم عزائم کی تکمیل کرتے اور مظلوم محنت کشوں کی مایوسی اور بے بسی اور مظالم سے دل برداشتہ ہو کر راہ فرار حاصل کرنے کی کوشش اور اس کوشش کے نتیجے میں مزید مصائب میں پھنسنے کی صورتحال کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

اِس باب کے آخری صفحات پر سلطانہ اور سلمان کی محبت کی کہانی اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔ سلمان اسے جہاں اس کی والدہ چاہتی ہے وہاں شادی کرنے کا مشورہ دے کر اسے حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ نیاز زہریلے انجکشن لگا کر سلطانہ کی والدہ کو موت کے منہ میں دھکیل دیتا ہے۔ نیاز جس طرح سلطانہ کی والدہ کو تشدد کا نشانہ بناتا ہے اس کا منظر دل چیر کر رکھ دیتا ہے۔ ساتھ ہی فلک پیما تنظیم کی سرگرمیاں عروج پر نظر آتی ہیں جو دراصل شوکت صدیقی کے انسان دوست نظریات کا مظہر ہیں خصوصاً علی احمد کے افکار متاثر کن ہیں۔ علی احمد جن نظریات کا اظہار کرتا ہے وہ شوکت صدیقی کی فکری جہات کے پسِ منظر میں اصلاح پسندی کی عمدہ مثال ہیں۔ کمیونسٹ نظریات کا اظہار سکائی لارک کے ذریعے کیا گیا ہے۔

آٹھویں باب میں ڈاکٹر زیدی کی صورت میں اس پیشہ سے وابستہ افراد کی زندگی کی جھلک دِکھائی گئی ہے جو فلک پیما تنظیم کے الیکشن میں حصہ لینے کے فیصلے کے بعد اکثریتی رائے سے الیکشن کے اُمیدوار نامزد ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی ان سوشلسٹ نظریات کے حامل طبقوں کی طرف سے سرمایہ داروں اور نیم جاگیرداروں کے بڑھتے قدموں کو روکنے کے لیے اقدامات کی جھلک نظر آتی ہے۔ ساتھ ہی اس خوفناک صورتحال کی منظر کشی کی گئی ہے جس میں طاقتور طبقہ کی نمائندگی کرتے خان بہادر فرزند علی کا کردار واقعات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس وقت دلچسپ صورتحال اختیار کر جاتا ہے جب کئی نوجوان اس کی تقریر روک کر چلا اُٹھتے ہیں۔

”جلسے سے ملی جُلی آوازیں اُبھریں۔

"جھوٹے کا منہ کالا۔"

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1, 2024

"دھاندلی بازی نہیں چلے گی"۔ "نہیں چلے گی"
"ووٹوں کی دلالی" نہیں چلے گی" نہیں چلے گی"۔[۲]

جلسے سے آنے والی یہ آوزیں اس سماجی شعور کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو فلک پیما سکائی لارکوں کے نمائندوں یعنی سلمان جیسے باشعور ورکروں نے عوام کے دِلوں میں ڈالا تھا۔ اگلے ابواب ہنگامہ خیزی سے بھرپور ہیں جہاں سلمان کی بیوی کے اس کے باس کے ساتھ ناجائز تعلقات کی کہانی ہمارے شہری معاشرے میں پائے جانے والے غیر اخلاقی اور ناجائز تعلقات کی بنا پر گھریلو اور ازدواجی زندگی میں طلاق جیسے مسائل پیدا ہونے کا سبب بنتے ہیں۔ ناول کے اختتام میں سب سے اہم واقعہ جو ہمارے معاشرے کے مثبت پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے وہ ہے پروفیسر احمد علی کا سلطانہ کے ناجائز بچے کو قبول کرتے ہوئے اس سے شادی کر لینا۔ اس واقعہ نے ناول کے پلاٹ کو خوبصورت انداز میں تکمیل تک پہنچایا ہے۔ پروفیسر احمد علی کے واقعات نے کہانی میں مثبت پہلوؤں کو نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔ نوشا کا انجام قیدی کی صورت میں دکھایا گیا ہے جو کہ ہمارے معاشرے کے المیوں میں سے ایک المیہ ہے۔

ناول کا نام شوکت صدیقی نے "خدا کی بستی" رکھا ہے جو کہ ایک علامتی اشارہ ہے کہ یہی ہے وہ خدا کی بستی جس کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا لیکن اس خدا کی بستی کا ہمارے طاقتور طبقے نے کیا حشر کیا ہے یہ اس کی المناک داستان ہے۔

شوکت صدیقی اس ناول میں اسلامی فکر و فلسفہ کا حوالہ دیتے ہوئے اس المیے کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جو اسلامی اُصولوں اور تعلیمات سے روگردانی کی صورت میں ہمارے معاشرے میں سماجی برائیوں اور اخلاقی گراوٹ کی وجہ سے کھڑا ہوا اور ہماری سماجی اور اخلاقی اقدار کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ حرام و حلال، نیکی و بدی، غلط و درست کا شعور ناپید ہو چکا اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل اتنے گھمبیر ہوتے گئے کہ ان کے سامنے بند باندھ کر اسلامی تعلیمات نظریہ پاکستان اور سچی جمہوری اقدار کے مطابق نئے ملک کی تعمیر و ترقی خواب بن کر رہ گئی۔ اس اخلاقی و سیاسی اور سماجی گراوٹ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خرابیوں نے ہمارے سماجی نظام کی بنیادیں برباد کر دیں۔ یہ مسائل اس معاشرے میں اس وقت نئے نئے پیدا ہو رہے تھے اور مملکت کو قائم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ اس وقت اس موضوع پر کسی اور تخلیق کار نے کوئی ناول بھی تخلیق نہیں کیا تھا۔ لہٰذا یہ موضوع ہمارے معاشرے کی حقیقی تصویر پیش کرنے کی پہلی کوشش قرار پاتا ہے۔ شوکت صدیقی کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے اس اپنے سنجیدہ اور اہم موضوع کو بہت عام، روزمرہ گفتگو اور فطری انداز میں پیش کیا۔ ڈاکٹر انور پاشا اس ناول کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہیں:

> "خدا کی بستی میں نو تشکیل پذیر پاکستانی معاشرہ خصوصاً شہری ماحول و معاشرے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ ناول ایک ایسے دَور کا آئینہ ہے جس میں نیم جاگیر دارانہ و نیم سرمایہ دارانہ نظام کا طبقاتی کردار اور اس میں موجود طبقاتی کشمکش تو ہے لیکن پاکستان کی شہری زندگی کی معاشرتی، تہذیبی اور اقتصادی اقدار کا تعین بحران کا شکار ہے۔ اس ناول میں ان مسائل کا ذکر ہے جن سے پاکستانی معاشرہ دوچار ہے۔"[۳]

تین بچوں کی کہانی اس ناول کا ایک اہم موضوع ہے جس کے ذریعے ناول نگار شوکت صدیقی ہمارے معاشرے کے کمزور طبقے میں پیدا ہونے والے بچوں کی بدقسمتی اور ایک فلاحی ریاست کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دِلاتے ہیں۔ حکومتیں تعلیم، صحت، علاج اور روزگار کی فراہمی کے دعوؤں پر قائم کرنے والے سیاست دان عملی طور پر اس طبقے میں پیدا ہونے والے بچوں کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ بچے اس پاک سرزمین کے بچے نہیں ہیں؟ ان کے حقوق کہاں ہیں؟ یہ بچے جس ماحول میں پیدا ہوتے ہیں اس ماحول کے نیاز جیسے کردار انہیں جرائم زدہ زندگی کی طرف آنے پر مجبور کرتے ہیں اور یہ ماحول ان بچوں کی معصومیت کو بے رحمی سے کچلتے ہوئے ان کی معاشی مجبوریوں کو استعمال کرتے ہوئے ناجائز دولت بڑھانے اور طبقاتی خلاء پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ ناول نگار نے نیاز کے قتل کی صورت میں یہ المیہ بھی ہمارے سامنے رکھا ہے کہ کس طرح استحصالی ہتھکنڈے اور سماجی ناانصافی معصوم لوگوں کو بڑے بڑے جرائم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس معاشرے کے بچے ساری زندگی اپنے اور اپنے پیاروں کے لیے جدوجہد کرتے بوڑھے ہو جاتے ہیں جس طرح اس ناول میں نوشا، راجہ اور شامی کی کہانی کا اختتام ہوتا ہے یہ اس معاشرے کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

ایک اور موضوع جس پر شوکت صدیقی نے اس ناول میں روشنی ڈالی ہے وہ اس سماج کے اس غربت زدہ طبقے کی عورت کی حالت زار ہے۔ نوجوان معصوم بچیوں سے لے کر خواتین تک ہر عمر کی عورت اپنے لیے اپنے پیاروں کے لیے سماجی تحفظ اور استحصال کے خلاف جدوجہد کرتی بے بسی کی تصویر بنی نظر آتی ہے۔ بے رحم معاشرہ ہوس، درندگی اور بے راہ روی میں اتنا بے ضمیر بن کر اس کو شکار کرنے کے لیے طرح طرح کے غلیظ ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔ اس کی مثال سلطانہ کی کہانی کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1, 2024

مجموعی طور پر اِس ناول کا موضوع دو حصوں میں تشکیل دیا گیا ہے، ایک حصہ غریب اور بے بس طبقے کی عزت اور روزگار کے لیے جذباتی اور سماجی کش مکش کو پیش کرتا ہے۔ اگرچہ ان افراد کے لیے عزت کی زندگی اور روزگار کی فراہمی ایک خواب ثابت ہوتی ہے لیکن ان کی جدوجہد کا جاری رہنا ہمت و مردانگی کے جذبات کو اُبھارتا اور انسانیت کے معیار کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔ دوسرا حصہ اس معاشرے کے بااختیار اور نیم جاگیر دار اور نیم سرمایہ دار طبقے کے غیر اخلاقی پہلوؤں، لالچ، ہوس، ناانصافی، بے ایمانی اور دولت کی خاطر انسانیت کی تذلیل جیسے گھناؤنے کردار سے پردہ فاش کرتا ہے۔

شوکت صدیقی کے اس ناول "خدا کی بستی" کے کرداروں پر نو آبادیاتی اثرات نمایاں ہیں۔ اگرچہ مملکت آزاد ہونے کے بعد خود مختاری تو حاصل ہو گئی لیکن ہجرت اور نئی آبادکاریوں کے نتیجہ میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جو سر چھپانے کے لیے چھت سے بھی محروم تھا اور پیٹ بھرنے کے لیے مزدوری کی تلاش میں کوئی بھی جائز نا جائز کام کر کے روپیہ پیسہ جمع کرنے کے لیے مجبور بھی۔ ساتھ ہی اس بے سہارا طبقہ کے پاس اپنے بچوں کو روزی روٹی کی خاطر بے رحم معاشرے کے حوالے کرنا ایک مجبوری بن گیا۔ یہ معصوم بچے جہاں مزدوری کے لیے جاتے جرائم پیشہ اور جنسی ہوس کا شکار بننا ان حالات میں ایک عام صورتحال تھی۔ اِسی شہر میں ایک ایسا طبقہ بھی موجود تھا جو خوشحال اور مستحکم تھا لیکن وہ اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو کر مظلوم اور بے سہارا لوگوں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنے کی بجائے ان کا استحصال کر رہا تھا۔ حیران کن طور پر یہ استحصالی طبقہ انہی مظلوم لوگوں کے ووٹ کی طاقت کو استعمال کرتے ہوئے حکومتی ایوانوں میں پہنچ کر طاقتور لوگوں کو قانونی تحفظ اور سماجی برتری برقرار رکھنے میں آکسیجن فراہم کر رہا تھا، لیکن اس ناول کے بعض کردار ایسے بھی تھے اور بعض تنظیمیں بھی ایسی تھیں جو اس پسے ہوئے طبقے کے حقوق کے لیے آواز بلند کر رہے تھے اور عملی طور پر ان کی تعلیم و صحت کے لے اقدامات اُٹھا رہے تھے لیکن استحصالی نظام ان کے لیے شدید مشکلات پیدا کر رہا تھا ان کو تشدد کا نشانہ بنا رہا تھا۔

مجموعی طور پر اس ناول میں ہر طرح کے کردار سامنے آتے ہیں لیکن خواتین کا کوئی مثالی کردار سامنے نہیں آتا جو تانیثی حقوق کے لیے جدوجہد کرتا دِکھائی دے۔ اس ناول میں بعض کردار مرکزی حیثیت کے حامل ہیں اور بعض ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کرداروں کا جائزہ لیتے ہیں۔

نوشا اِس ناول کے ایک ایسے بچے کا کردار ہے جو اس ناول کی کہانی میں آغاز سے اختتام تک زندگی کی جدوجہد میں مصروف عمل نظر آتا ہے۔ وہ بار بار تشدد اور جنسی ہوس کا نشانہ بھی بنتا ہے اور مالک مکان کے اُکسانے پر چوری جیسے جرم میں بھی ملوث ہو جاتا ہے اور اپنے دوستوں شامی اور راجہ کے ساتھ گھر سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ نوشا کے کردار کے ذریعے ناول نگار نے معصوم بچوں کو استحصال کا شکار ہوتے دِکھایا ہے جو نہ چاہتے ہوئے بھی بہ امر مجبوری جرائم میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ جب وہ اپنی ماں اور بہن کی تباہی کا بدلہ لینے کے لیے نیاز کو قتل کرنے کے بعد عدالت میں پیش کیا جاتا ہے اور مجسٹریٹ اسے قید کی سزا سناتا ہے تو نوشا چلا چلا کر کہتا ہے:

"مجھے پھانسی دے دو"، "مجھے پھانسی دے دو"، "میں زندہ نہیں رہنا چاہتا"۔[۴]

راجہ اس ناول میں ایک ایسے معصوم بچے کے طور پر ابتدا سے ہی کہانی کا حصہ بنتا ہے جو ایک جھونپڑی میں رہتا ہے اور کوئی دوسرا روزگار کا سلسلہ تلاش نہ کر سکنے کی بناء پر ایک بوڑھی معذور گداگر کی ریڑھی کھینچ کر زندگی کی جدوجہد کا آغاز کرتا ہے۔ کبھی کبھی وہ آنکھ بچا کر گداگر کی جمع کی ہوئی خیرات سے ہاتھ صاف کر لیتا ہے مگر اس کی طے شدہ مزدوری آٹھ آنے ہمیشہ گداگر ٹال مٹول کرتے ادا کرتا ہے۔ ایک المناک واقعہ اس وقت پیش آتا ہے جب ایک امیر آدمی اسے نصیحت کرتا ہے کہ یہ کام نہ کرو اس گداگر کو خطرناک مرض ہے لیکن وہ خیرات نہیں دیتا نہ ہی اسے یہ کام چھوڑ کر کوئی دوسرا کام کرنے کا طریقہ تجویز کرتا ہے۔ اس موقع پر گداگر کے الفاظ دل چیر کر رکھ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم آزاد کہتے ہیں:

> "راجہ کا کردار بہت جاندار ہے۔ یہ اتنے مؤثر انداز میں سامنے آتا ہے کہ ناول کا ہیرو معلوم ہونے لگتا ہے۔ زندگی کی تلخیوں، ناکامیوں اور آزمائشوں سے گھبرا کر وہ خودکشی کرنا چاہتا ہے مگر یہ بھی اس کے نصیب نہیں ہیں۔ گمراہیوں میں مبتلا ہونے کے باوجود بھی وہ خوددار ہے۔ اس کے اندر عزم کی قوت ہے۔ انتہائی ناموافق حالات سے بھی مردانہ وار مقابلے کی صلاحیت رکھتا ہے، مگر معاشرتی سختیوں اور تلخ تر حقیقتوں سے آخر کار وہ ہار جاتا ہے اور زندگی کی آخری سانسیں فٹ پاتھ پر لیتا نظر آتا ہے"۔[۵]

شامی ان تین دوست بچوں میں سے تیسرا بچہ ہے جو کہانی کے آغاز میں نظر آتے ہیں اور اختتام تک ان کی کہانی مسلسل جدوجہد اور بے بسی کی تصویر پیش کرتی ہے۔ باپ کے تشدد کا ایک منظر ملاحظہ کریں:

> دُکانداروں نے منت سماجت کی، شامی کے باپ کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ قسمیں دیں کہ اب اور نہ مارے۔ باپ نے اس کے بعد شامی کو مارا تو نہیں البتہ کئی بار جھنجھلا کر مارنے کے لیے ضرور اُٹھا۔ جب بھی شامی سسکی بھر تا وہ جل کر اسے گالیاں دیتا۔"

ساتھ ہی وہ دوستوں کا دوست اور ان کے لیے محبت کے جذبات رکھتا ہے اس کے جملے دل میں رس گھولتے ہیں۔

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1, 2024

"شامی نے اسے حیرت سے دیکھا ابے کہاں سے مار لایا۔"[۶]

انو، نوشا اور سلطانہ کا سب سے چھوٹا بھائی تھا۔ اسے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا لیکن اس کا یہ شوق حالات کی ستم ظریفی کا نشانہ بن گیا۔ اس نے پوری زندگی اپنی بہن کے ساتھ مصائب کا سامنے کرتے گزاری۔ نیاز کے ظلم بھی خاموشی سے سہتا رہا۔

"انو کے رخسار پر اُنگلیوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ سسکیاں بھر کر بے چارگی سے رو رہا تھا۔ سلطانہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تو اپنی بے کسی پر خود اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔"[۷]

اس ناول کا سب سے اہم اور مرکزی کردار سلطانہ ہے جو اپنے بھائیوں انو اور نوشا سے عمر میں بڑی ہے۔ سلطانہ اس ناول کی ہیروئن ہے جس کو مختلف لوگ جن میں نیاز اور فیاض شامل ہیں جنسی ہوس اور تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ سلمان سے اسے محبت ہوتی ہے لیکن سلمان کے جذبات کمزور پڑ جاتے ہیں۔ سلطانہ کی مایوسی اس معاشرے کی عورتوں کی حالت زار کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اسے اپنے باپ کی وفات کے بعد مسلسل مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا مالک مکان نیاز اسے دیکھ کر مختلف اوچھے ہتھکنڈوں کے ذریعے اسے نہ صرف ہوس اور تشدد کا نشانہ بناتا ہے بلکہ اس کی ماں کو بھی قتل کر دیتا ہے۔ وہ اس کی ہوس کا نشانہ بنتی ہے لیکن خاموش رہتی ہے۔ اس ظلم کے خلاف آواز بلند نہیں کرتی۔ بار بار ظلم سہنے اور کئی مردوں کے ساتھ رہنے کے باوجود وہ خود جرائم سے دُور رہتی ہے اس کے کردار کی عظمت اس وقت کھل کر سامنے آتی ہے جب پروفیسر علی احمد اسے اس کے بچے سمیت قبول کرتے ہوئے نکاح کر لیتا ہے۔ اس پورے ناول میں یہ سب سے اہم اور مثبت پہلو سامنے آتا ہے، لیکن اس کا اپنے ساتھ پیش آنے والے اندوہ ناک واقعات سماجی زندگی کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کس طرح پسے ہوئے طبقات کی نوجوان لڑکیاں چاہے جانے کے حسین خوابوں کی عدم تکمیل کے بعد سماجی شعور اور نسوانی حقوق کی اہمیت سے بے بہرہ ہو جاتی ہیں۔

ان سب بچوں جن کے کرداروں کا جائزہ مندرجہ بالا لائنوں میں پیش کیا گیا ہے ان کا المیہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہجرت کر کے آنے والے لوگوں کے بچے تھے۔ کراچی آ کر ان کو غیر متوقع حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی خواہشات اور خواب کچلے گئے یہ بچے نہ تعلیم حاصل کر سکے اور نہ ہی روزگار۔ ساری زندگی معاشرتی ناہمواری، ناانصافی اور سماجی برائیوں نے ان کو سکون سے جینے نہیں دیا۔

ڈاکٹر سہیل بخاری، سلطانہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ہیروئن سلطانہ کا کردار بھی کمزور ہے ایک طرف تو واقعات یہ بتاتے ہیں کہ وہ ابتدا سے آخر تک نیاز کی طرف مائل رہی ہے۔ دوسری طرف وہ سلمان کے گھر جا کر اس سے شادی کی درخواست کرتی ہے اور نڈھال ہو کر شاہد کے کندھے پر بھی سر ٹکا دیتی ہے۔"[۸]

سلمان اس ناول میں ایک اور نوجوان لڑکے کا کردار ہے جس کی کہانی انسانی ہمدردی کے اس واقعے سے شروع ہوتی ہے جب وہ راستے میں نوشا کو حادثہ کا شکار ہو کر زخمی گرا پڑا دیکھتا ہے اور اس کے گھر چھوڑنے آتا ہے لیکن نوشا کے گھر میں جب وہ سلطانہ کو دیکھتا ہے تو اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کا سلسلہ سلطانہ سے محبت کی صورت میں جڑ جاتا ہے وہ کئی بار گھر اور باہر ملتے ہیں۔ اسے مختلف سرگرمیوں میں مصروف دکھایا گیا ہے۔ یہ ایک بے بس اور مجبور عورت کی عکاسی کرتی ہے۔ جوانی میں شوہر کی وفات کے بعد خود کو حالات کے حوالے کر دیتی ہے اور نیاز سے شادی کر لیتی ہے، لیکن نیاز اسے ہلاک کر دیتا ہے جس کے ساتھ ہی اس کے سارے بچے گھر سے منتشر ہو کر برباد ہو جاتے ہیں۔ یہ اقتباس اس کی بے بسی کی طرف اشارہ کرتا ہے جب وہ سلمان سے التجا کرتی ہے:

"اب یہی ہو سکتا ہے کہ میں سلطانہ کو تمہارے ساتھ کر دوں دنیا زیادہ سے زیادہ یہی تو کہے گی کہ سلطانہ بھاگ گئی میں یہ رسوائی بھی قبول کر لوں گی۔"[۹]

غربت میں پسے ہوئے ہمارے معاشرے کی یہ ایک حقیقت ہے کہ مائیں مجبور ہو کر اپنی بیٹیوں کو ایسے اقدامات کے لیے بھی تیار ہو جاتی ہیں جو معاشرے کی نظر میں بالکل ناپسندیدہ ہوتے ہیں۔ سلطانہ کی ماں اپنی معصوم بیٹی کو نیاز کی ہوس کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے یہ انتہائی قدم اُٹھانے کے لیے بھی تیار تھی لیکن سلمان ایک کمزور شخصیت کا حامل کردار ثابت ہوتا ہے۔

مستری عبداللہ اِس ورکشاپ کا مالک ہے جس میں معصوم بچے حالات سے تنگ آ کر مزدوری کرتے ہیں لیکن یہ ان کے جذبات کا احساس نہیں رکھتا انھیں غیر انسانی سلوک کرتے ہوئے جنسی اور جسمانی تشدد کرتا اور غلیظ گالیاں دے کر ذہنی اذیت سے دوچار کرتا ہے۔ سماجی ناانصافی اور انسانی حقوق کی پامالی کا حال اس کردار کے ذریعے واضح ہوتا ہے۔

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1, 2024

نیاز ایک ایسا انسان ہے جو بے شمار چھوٹے چھوٹے جرائم میں ملوث ہے۔ فرنیچر کے کام کو چھوڑ کر کباڑیہ بن جاتا ہے جس گھر میں سلطانہ رہتی ہے اس کی ملکیت رکھتا ہے اور سلطانہ اور اس کی والدہ دونوں اس کے تشدد اور ظلم و ستم کا شکار ہوتی ہیں۔ سلطانہ کے بھائی کے ہاتھوں قتل ہو کر انجام کو پہنچتا ہے۔ وہ ایک قابلِ نفرت کردار بن کر اُبھرتا ہے جس نے ایک خاندان کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا دیا۔

خان بہادر فرزند علی اس معاشرے کو کنٹرول کرنے والے ایک خاندانی رئیس کا کردار ہے جو بالکل ایک حقیقی انسان کی طرح دِکھائی دیتا ہے۔ وہ طاقت کے نشے میں حلال و حرام، نیک و بد اور اچھے اور برے کی تمیز بھول چکا ہے۔ اس کے سامنے صرف اور صرف ایک ہی مقصد نظر آتا ہے اور وہ ہر حال میں اپنی بالادستی اور مقام و مرتبہ کو برقرار رکھنا ہے۔ اس مقصد کے لیے ہے کبھی ایک نیک صوفی بن کر کبھی ایک غریب دوست سماجی شخصیت بن کر کبھی غریبوں کی نمائندگی کرتا ہوا سیاسی نمائندہ غرض اس کے کئی روپ ہیں اور اصلی روپ اس وقت کھل کر سامنے آتا ہے جب وہ فلک پیما تنظیم کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے اور فلک پیما تنظیم الیکشن میں اس کے مدِ مقابل اپنا اُمیدوار ڈاکٹر زیدی کی صورت میں کھڑا کر دیتی ہے۔ یہ کمینہ انسان ووٹ کا ریٹ مقرر کر دیتا ہے اور پھر بھی جب الیکشن میں کامیابی کی اُمید نظر نہیں آتی تو فلک پیما تنظیم اور ڈاکٹر زیدی کے ہسپتال پر حملہ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ نیاز اور خان بہادر کے کردار کے حوالے سے ڈاکٹر انور پاشا اظہارِ خیال کرتے ہیں:

> ”یہ دونوں کردار نو تشکیل مملکت کے سرمایہ دارانہ نظام کے پروردہ کردار ہیں جو دولت کی ہوس میں کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ نیاز جہاں ہوس زر اور ہوس جنس کی خاطر معصوم زندگیوں کو موت اور تاریکی کے غار میں دھکیلنے میں عار محسوس نہیں کرتا وہاں خان بہادر فرزند علی بھی ہوسِ زر میں انسانیت اور ایمان کے تقدس کو پامال کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتا۔“[۱۰]

پروفیسر احمد علی اس معاشرے کے اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنی زندگی کو ایک نصب العین کے تحت گزارتے ہیں جو خیر اور شر میں تمیز رکھتے ہیں ان کی پروقار شخصیت انسانیت کی خدمت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ اِن کے علاوہ اس ناول کے دیگر کرداروں میں سلمان کے والد، والد کے بھائیوں، صفدر بشیر جعفری، ڈاکٹر موٹو وغیرہ کے کردار بھی کافی جاندار ہیں خصوصاً سلمان کے والد کی زندگی مسلسل جدوجہد کی ایک بے نظیر مثال ہے۔ وہ ساری زندگی اپنے بچوں کے لیے محنت کرتے ہیں اور آخری عمر میں اللہ کی یاد میں مصروف ہو کر ہر وقت عبادت میں مشغول رہتے ہیں اس کے کردار سے اس سماج کے انسانوں کے لیے شوکت صدیقی ایک پیغام چھوڑتے ہیں کہ انسان سکون کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے لیکن سکون تو اللہ کی عبادت میں ہے۔

کوئی بھی ادب پارہ کسی نہ کسی تکنیک کی مدد سے وجود پاتا ہے، لیکن موضوع اور مواد تکنیک میں تبدیلی کا موجب بنتے ہیں۔ واقعات پیش کرتے ہوئے شوکت صدیقی نے اس ناول میں بیانیہ تکنیک استعمال کی ہے۔ واقعات کی ڈرامائی پیش کش نے حیرت اور دلچسپی کا ایک ایسا ربط قائم کیا ہے جو ابتدا سے آخر تک قائم ہے ہر قصہ پوری باریکی اور تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ناول کا فوکس کراچی شہر کی حقیقی زندگی کی طرف مسلسل برقرار رہتا ہے۔ انداز میں روایتی پن بھی موجود ہے۔ قصہ اپنی روایت کے ذریعے آگے بڑھتا ہے بعض کردار مسلسل مصروفِ عمل رہتے ہیں جن کے حالات زندگی کے ذریعے اس ناول کا فکری تصور پوری شکل کے ساتھ اُبھرتا ہے۔ ناول کا آغاز کراچی کی بے سہارا زندگی کی ایک جھلک سے شروع ہوتا ہے جس میں بچوں کو تاش کے پتوں پر لڑتے جھگڑتے اور مذاق کرتے دکھایا گیا ہے۔ ایک المیہ جو ناول نگار قاری کو دِکھانا چاہتے ہیں وہ ناول کے پہلے منظر سے ہی تمام خیالات کو اپنے اندر جکڑ لیتا ہے جن بچوں کے ہاتھوں میں قلم دوات اور کتاب ہونی چاہیے تھی ان کے ہاتھ میں تاش کے پتے، ورکشاپ کے اوزار، فیکٹری کی بیڑیاں، گداگر کی ریڑھی اور مالک کی مار کے نشانات ہیں۔ ناول نگار نے سلمان کے مکالموں کو فلیش بیک کی تکنیک کے ذریعے نمایاں کیا ہے جو اس ناول کے اُن چند کرداروں میں سے ہے جو مڑ مڑ کر اپنے ماضی کی طرف دیکھتا ہے اور مستقبل کی فکر کرتا ہے آہیں بھرتا ہے بے بسی کا اظہار کرتا ہے اور قسمت بدلنے کے راستے تلاش کرتا ہے جب وہ اپنے بھائیوں کی زندگی کا جائزہ لیتا ہے تو ان کا موازنہ نیاز کی زندگی سے کرتے ہوئے سوچتا ہے کہ بعض اوقات ایک اَن پڑھ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان دونوں اپنے مقاصد کے حصول میں کتنے خود غرض بن جاتے ہیں۔ سلمان کے جملوں میں معنی و مفہوم کی ایک دنیا آباد نظر آتی ہے:

> ”سلمان سوچا کرتا کہ یہ بدقسمت بوڑھا کس قدر احمق ہے۔ اس سے زیادہ سمجھ دار تو نیاز کا باپ تھا، جس نے اسے کوئی تعلیم نہیں دلائی اپنی گاڑھی کمائی کا ایک پیسہ اس پر خرچ نہیں کیا۔ نیاز کو بھی اسی سم سم کی تلاش تھی جس کی تلاش میں اس کے بھائی سرگرداں تھے لیکن نیاز نے اس سم سم کا سراغ لگا لیا تھا۔ اَن پڑھ کباڑیہ تین گریجویٹوں سے بازی لے گیا۔“[۱۱]

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1, 2024

سلمان کے یہ الفاظ ایک اسی کربناک صورتحال کی طرف اشارہ کرتے ہیں جب معاشرے میں سماجی تفریق انسانی قدروں کو پامال کر دیتی ہے۔ تعلیم یافتہ اور جاہل سب صرف اور صرف دولت کے حصول کو ہی واحد وسیلہ سمجھ کر اس کی ہوس میں جت جاتے ہیں کیوں کہ تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں کو جب میرٹ پر ملازمتیں نہیں ملتیں تو وہ احساسِ محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مریم حسین اس صورتحال کے حوالے سے مصنف کے سماجی شعور کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

"شوکت صدیقی کا تصورِ زندگی یہ ہے کہ محنت کے استحصال سے جرائم کی آبیاری ہوتی ہے اور واقعاتِ زندگی کے چناؤ میں ان کے تصورِ زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔"[۱۲]

شوکت صدیقی نہایت سادگی سے جملے بناتے ہوئے بات بیان کرتے ہیں۔ مکالموں کی طرح جملے بھی چست ہیں اس سے منظر کی تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات شوکت صدیقی معاشرے کی سماجی ہمواریوں پر طنز کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ہر بات جو کہتے ہیں موقع محل کی مناسبت سے فٹ بیٹھتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ جملے ملاحظہ کریں:

"کہو اُستاد! کیسا بیمہ کیا۔ "اے یہ رہی بیگی۔ واہ میری جان، میں تیرے قربان۔"
سالو! "آج تم کو پداماروں گا۔"[۱۳]

بعض موقعوں پر شوکت صدیقی اشاروں، کنایوں کے ذریعے مفہوم واضح کرتے ہیں لیکن منظر کشی اتنی دلکش ہوتی ہے کہ قاری کو بات کا مطلب سمجھتے ہوئے ذرا بھی دیر نہیں لگتی۔ بعض موقعوں پر شوکت صدیقی تمثیل نگاری کے عمدہ نمونے پیش کرتے ہیں۔ بعض موقعوں پر موقع کی مناسبت سے گالیوں کا استعمال اس انداز میں کرتے ہیں کہ بات میں حقیقت کا رنگ بھر جاتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ ناول اس دور کے ہمارے معاشرے کا ترجمان بن کر سامنے آتا ہے جب ملک کی بنیادیں استوار کی جا رہی تھیں۔ شوکت صدیقی اس کی بے رحم حقیقت نگاری کرتے ہوئے تمام پہلوؤں کو اُجاگر کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اُنہوں نے افسر شاہی کی جانب داری اور غیر جانب داری اور عوام کے ہمدرد طبقوں کو جو ان کے اصلی نمائندہ ہونے کے اہل ہیں، کو صاحب اقتدار ہونے سے محروم کرنے کے لیے استعمال کیے جانے والے ہتھکنڈوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح شوکت صدیقی یہ ثابت کرنے میں کامیاب رہے ہیں کہ اس سماج میں طاقتور کسی قانون کی گرفت میں نہیں آتا جب کہ کمزور اور غریب کے لیے ملکی قوانین تو موجود ہیں ہی طاقتور لوگوں کے خود ساختہ ظالمانہ قوانین بھی ان پر گرفت کیے رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے شوکت صدیقی نے اپنے اس ناول میں سماجی حقیقت نگاری کی روایت کو وسعت دی ہے جس کی تعمیر پریم چند نے کی تھی۔ ان کا طبقاتی شعور اور انسان دوستی کا تصور ناول میں پریم چند سے آگے کی راہ دکھاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اسلم آزاد، ڈاکٹر، "اُردو ناول آزادی کے بعد"، نکھار پریس، اترپردیش، دسمبر ۱۹۸۱ء، ص ۲۵۲

۲۔ شوکت صدیقی، "خدا کی بستی"، کتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۵ء، ص ۲۸۰

۳۔ انور پاشا، ڈاکٹر، "ہندو پاک میں اُردو ناول، تقابلی مطالعہ"، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ۱۵۳

۴۔ شوکت صدیقی، "خدا کی بستی"، کتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۵ء، ص ۴۷۹

۵۔ اسلم آزاد، ڈاکٹر، "اُردو ناول آزادی کے بعد"، نکھار پریس، اترپردیش، ۱۹۸۱ء، ص ۲۳۶، ۲۳۷

۶۔ شوکت صدیقی، "خدا کی بستی"، کتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۵ء، ص ۳۰

۷۔ شوکت صدیقی، "خدا کی بستی"، کتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۵ء، ص ۳۱۹

۸۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، "اُردو ناول نگاری"، مکتبہ جدید، لاہور، ص ۲۳۴

۹۔ شوکت صدیقی، "خدا کی بستی"، کتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص ۱۲۰

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1, 2024

۱۰۔ انور پاشا، ڈاکٹر، "ہندو پاک میں اُردو ناول، تقابلی مطالعہ"، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ۲۲۶

۱۱۔ شوکت صدیقی، "خدا کی بستی"، کتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص ۳۵۶

۱۲۔ مریم حسین، ڈاکٹر، "اُردو کے افسانوی ادب کے تناظر میں شوکت صدیقی کے فکر و فن کا تنقیدی اور تحقیقی جائزہ"، مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی، شعبہ اردو جامعہ کراچی، ۲۰۰۵ء، ص ۱۸۶

۱۳۔ شوکت صدیقی، "خدا کی بستی"، کتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص ۳۱۴